بنیاد جلد دوم شمارہ:۱، ۲۰۱۱ء

سنبل نسیم*

اُردو غزل
میں اساطیری حوالے (۱۹۷۰ عیسوی کی دہائی میں)

اُردو غزل میں دیومالائی اور داستانوی عناصر کا تجربہ ۷۰ء کی دہائی کے غزل گو شعرا نے ایک اجتماعی اور مشترکہ طرز احساس کے ساتھ کیا۔ یہ رجحان نظم اور غزل گو ہر دو اصناف میں برابر جاری رہا۔ غزل میں دیومالا، داستانوں اور تہذیبی تاریخ سے متعلق لفظیات کا ذخیرہ موجود ہونے کی وجہ ۶۵ء اور ۷۱ء کی جنگوں کے بعد پیدا شدہ صورتحال سے تخلیق کاروں کی افتادِ طبع کا حصہ بنا۔ ۷۰ء یعنی سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد کے شعرا نے اپنے کلام میں دیومالا عناصر کے ذریعے اپنے ماضی کو بیان کر کے حالاتِ حاضرہ کا جائزہ لینے کی سعی کی ہے۔

نئی پاکستانی غزل، مئے وستخط کے دیباچے میں محمد خالد نے ۷۰ء کی دہائی کے حوالے سے لکھا ہے:

> اُردو غزل کے لیے ستر کی دہائی اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس میں غزل کی کچھ مختلف شکل ہمارے سامنے آئی۔ اس دہائی میں شعرا کی نئی نسل نے اپنا سفر آغاز کیا..... اس نسل کا شاعر اپنی ذات کے خول میں قید ہو کر محض تنہائی کا رونا نہیں روتا اور یہی اس عہد کی غزل کی پہچان ہے۔ اس غزل کا کینوس محض فرد کی فردیت نہیں، چہار سمت پھیلی ہوئی خوشیوں اور غموں سے بھری ہوئی کائنات ہے۔[۱]

---

* سنبل نسیم، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین، وحدت کالونی، لاہور۔

غلام حسین ساجد اپنے مضمون ''پاکستانی اردو ادب کے ساٹھ سال'' میں ۷۰ء کی دہائی کی غزل کے بارے میں فرماتے ہیں:

> قیام پاکستان مسلم امہ کی امنگوں کا محل تھا تو سقوط مشرقی پاکستان، پاکستان کے ساتھ جنم لینے والی نسل کے خوابوں کا کھنڈر..... اس عہد میں شاعری کا آغاز کرنے والی نسل کو تہذیبی یا اساطیری غزل کی تخلیق کا اشارہ دیا۔ اس عہد کی غزل کا منظر نامہ اسلامی تہذیب کی علامتوں اور استعاروں پر محیط ہو کر انسانی تہذیب کے بچپن تک پھیلتا گیا ہے۔ ۲

سراج منیر اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں:

> یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ اس نسل کے تخلیقی ظہور کے ساتھ ساتھ پاکستان کی تاریخ ایک بہت بڑی قومی واردات سے گزرتی ہے۔ اس نسل کے پورے طرز احساس پر اس موسم کا عکس جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ ۳

جدید شعرا کے ہاں یہ رجحان، کہ دیومالا کی طرف رجوع کر کے، اپنے موجود کی رمزیت کی تلاش کی جائے، کو غلام حسین ساجد فطری عمل قرار دیتے ہیں اس ضمن میں ان کا کہنا ہے:

> موجود کی بے حسی اور جمود کو شاید اسی طرح توڑنا ممکن تھا۔ جس سے راستہ نکالنے کے لیے خواب، چراغ، آئینہ، آسمان شمشیر، رہوار، جھروکے، محل سرا، خدام و خرگاہ اور ایسی بہت سی تہہ دار علامتوں کو استعمال میں لانا ضروری تھا۔ ۴

ان کے نزدیک غزل میں دیومالا کا استعمال اس لیے بھی ضروری تھا کہ:

> ''شعرا کو اپنے گھائل فکری وجود کے استحکام اور اثبات کے لیے ماضی میں بہت پیچھے تک پلٹ کر دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ۵

۶۰ء کی دہائی میں ناصر کاظمی اور منیر نیازی سمیت بہت سے شعرا نے ماضی کی طرف رجوع کرنے کی سعی کی اور اساطیر کو استعمال کیا۔ ناصر کاظمی نے اگرچہ ماضی کی بازیافت ہندوستانی تہذیب و تمدن کے وسیلے سے کی لیکن منیر کے ہاں کینوس وسیع تر ہے۔ تہذیبوں کی شکست و ریخت اور صاحب اوج و کمال اقوام کے زوال کے بعد خرابوں کی تصویر کشی منیر کی غزل کا بہت جاندار حوالہ ہے:

ے ہے باب شہر مردہ گزرگاہ بادشام
میں چپ ہوں اس جگہ کی گرانی کو دیکھ کر

ے مرے پاس ایسا طلسم ہے جو کئی زمانوں کا اسم ہے
اسے جب بھی چاہا بلا لیا اسے جو بھی چاہا بنا دیا

یہاں رئیس امروہوی کی ایک غزل کے چند اشعار بھی برمحل ہیں جو ہجرت کے تجربے کے تناظر میں اساطیر کی شعری معنویت و اہمیت اجاگر کرتے ہیں:

ے دیار شاہد بلقیس اداسے آیا ہوں
میں اک فقیر ہوں شہر سبا سے آیا ہوں

ے جہان نو کی طلب ہے اور اس خرابے میں
سواد اصطخر و نینوا سے آیا ہوں

ے مرے رموز کا عرفاں کسے نصیب کہ میں
سروش روح ازل ہوں سما سے آیا ہوں ۶

سقوط مشرقی پاکستان ۱۹۷۱ء کا سانحہ ایک ایسا سانحہ تھا جس نے افراد کے اندر اپنے وجود کے ادھورے پن کا احساس پیدا کیا۔ ۷۱ء سے پہلے ۶۵ء کی جنگ کے زخم ابھی تازہ تھے۔ آدھے وجود کے احساس نے وطن عزیز کے باسیوں کی روح کو مجروح کیا تو شعرا نے ماضی کے گمشدہ گوشوں میں پناہ لینی چاہی اور اس طرح ۷۱ء کی غزل میں اساطیری عناصر وافر نظر آنے لگے۔ اس کھیپ کے غزل گوؤں کا تخلیقی سرمایہ ''اساطیری غزل'' کہلاتا ہے۔

۱۹۷۰ء کے بعد کی غزل اکبر علی عباس، ثروت حسین، شبیر شاہد، محمد اظہار الحق، افضال احمد سید، محمد خالد، خالد اقبال یاسر، غلام حسین ساجد، صابر ظفر، ایوب خاور، راشد مفتی، جلیل عالی، جمال احسانی، سلیم کوثر، صغیر ملال، ساجد امجد، صابر وسیم، ابرار احمد اور شاعرات میں پروین شاکر، شاہدہ حسن اور فاطمہ حسن خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان تمام شعرا کی غزل میں دو بساط یاراں کے لٹنے، شیشہ و جام کے ٹوٹنے اور سرشام دلوں کے بجھ جانے کے تذکرہ تواتر اور تسلسل سے ہوا ہے۔ جہاں تک اساطیری و تہذیبی علامتوں کا تعلق ہے تو ان میں شبیر شاہد، ثروت حسین، افتخار عارف، عرفان صدیقی، محمد اظہار الحق، افضال احمد سید، خالد اقبال یاسر، غلام حسین ساجد، ایوب خاور اور چند دیگر شعرا کے ہاں یہ تجربات بھرپور نظر آتے ہیں۔ زیر نظر مضمون میں ان شعرا کے ہاں خاص طور پر اساطیری عوامل کی نشاندہی کی جائے گی اور یہ تجزیہ کرنے کی سعی کی جائے گی

کہ اساطیری عناصر کو شعری تجربے کا حصہ بنانے کی جو روایت ولی سے اب تک چلی آ رہی ہے۔ ۷۰ء کی دہائی تک آتے آتے وہ کیا شکل اختیار کر چکی ہے۔ ''شبیر شاہد نے اردو غزل میں ایک نئے ''Trend'' کا اضافہ کیا ہے۔''[۸] جس کی وجہ سے ان کو ان کے معاصرین trendsetter شاعر کہا کرتے ہیں۔ شبیر شاہد کی شعری تربیت دو شخصیتوں کے زیر اثر ہوئی سجاد باقر رضوی اور ناصر کاظمی، گو تخلیقی حوالے سے دونوں کے مزاج مختلف ہیں لیکن شبیر شاہد نے ان کے اس تخلیقی اختلاف کے امتزاج پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھی۔ شبیر شاہد کا درج ذیل شعر بھی اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ سجاد باقر رضوی اور ناصر کاظمی سے متاثر تھے۔

؎ باقر کا شاگرد ہوں شاہد
ناصر کا متوالا ہوں میں

شبیر شاہد اچانک منظر عام سے غائب ہو گئے۔ ان کے ہم عصر شاعر محمد خالد بتاتے ہیں کہ جانے سے پہلے شبیر شاہد نے ہرمن ہیسے کا ناول سدھارتھ پڑھا جس کے بارے میں وہ اکثر باتیں کیا کرتے تھے۔ ان پر اس ناول نے بھی گہرے اثرات ڈالے اور ان کی ذہنی کایا کلپ کا باعث بنا۔ انہوں نے کئی راتیں راوی کنارے دریا سے باتیں کرتے گزاریں۔ جانے سے پہلے وہ تمام دوستوں سے ملے اور اپنی دانستہ و نادانستہ غلطیوں کی معافی مانگی۔ شبیر شاہد نے اپنا تمام کلام نذر آتش کر دیا تھا اور ایک دن اچانک غائب ہو گئے۔ ان کو ان کے دوست احباب ابھی بھی اپنی باتوں میں یاد کرتے ہیں شبیر شاید کا بیشتر تخلیقی اثاثہ اُن کے وجود کی طرح پردہ غیب میں ہے۔ جو کلام ملا ہے وہ مختلف رسائل سے لیا گیا ہے یا جو دوست احباب کی ڈائریوں میں محفوظ تھا، ان کے ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ تاہم ان کے معاصرین انہیں نئی غزل کے پیش رو قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے ۶۰ء کی دہائی کے آواخر اور ستر کی دہائی کے اوائل میں شعر کہنا شروع کئے۔ ان کی محدود میسر تخلیقات میں ۷۰ء کے بعد اردو غزل میں اساطیری علامتوں کے استعمال کی ایک نئی خوشگوار روایت کا آغاز ہوتا ہے۔ درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیں:

؎ نگاہ میں ہے شکوہ اس کی عمارتوں کا
وہ معبدوں کا جلال بھولا نہیں ہے مجھ کو

؎ وہاں ہیں انگور کے چمن، دیویوں کے درشن

بہشت کے اہتمام سارے ہیں اس کنارے

؎ کن فیکون کی پہنائی میں
کیف سخن کا دریا ہوں میں

؎ لیلیٰ لیلیٰ کی آوازیں
اور صحرا کا سناٹا ہے

؎ ریگ بیاباں کے دامن میں
ابن علی کا شہر بسا ہے

؎ وہاں ہے فیضان آسماں کی ضیافتوں کا
فلک نے نعمت کے خواں اتارے ہیں اس کنارے

ثروت حسین ۷۰ء کی دہائی میں ابھرنے والی ایک الگ اور منفرد آواز ہیں: ثروت کے شعری اسلوب میں اساطیر کی معنویت یک سطحی نہیں ہے بلکہ انسان کی داخلی نفسیات سے لے کر خارجی سماجیات تک کا بیک وقت احاطہ کرتے ہوئے روحانی تسکین کا سامان ہے۔[۹]

؎ فرات فاصلہ و دجلہ دعا سے ادھر
کوئی پکارتا ہے دشت نینوا سے ادھر

؎ اسی کنارہ حیرت سرا کو جاتا ہوں
میں ایک سوار ہوں کوہ ندا کو جاتا ہوں

؎ زرد زبور تلاوت کرتی ہے تصویر خزاں کی
عین بہار میں کیسے کیسے خواب نظر آتے ہیں

؎ لہر لہر آوارگیوں کے ساتھ رہا
بادل تھا اور جل پریوں کے ساتھ رہا

؎ راتوں سے ڈری ہوئی زمیں کو
سورج نے چھپا لیا پروں میں

؎ میں سو رہا تھا اور مری خواب گاہ میں
اک اژدہا چراغ کی لو کو نگل گیا

ے کنجِ خزاں آثار میں ثروت آج یہ کس کی یاد آئی
ایک شعاعِ سبز اچانک تیر گئی پاتالوں میں

۷۰ء کی دہائی کی غزل نے جن داستانی کرداروں کو اپنا حصہ بنایا اس میں شہزادے شہزادیاں سرفہرست ہیں۔ ثروت حسین کے ہاں درج ذیل اشعار میں شہزادی سے براہ راست انداز تخاطب ہے۔

ے شہزادی تجھے کون بتائے تیرے چراغ کدے تک
کتنی محرابیں پڑتی ہیں کتنے در آتے ہیں

ے شہزادی ترے ماتھے پر یہ زخم رہے گا
لیکن اس کو چومنے والا پھر نہیں ہوگا

ے ان اونچی سرخ فصیلوں کا دروازہ کس پر وا ہوگا
گھوڑے کی باگیں تھامے ہوئے شہزادہ سوچ رہا ہوگا

ے مرے سینے میں دل ہے یا کوئی شہزادہ خودسر
کسی دن اس کو تاج و تخت سے محروم کر دیکھوں

ان کرداروں کے علاوہ شہزاد، بلقیس، صوفیہ اور سلیمان کے کردار بھی ثروت حسین کی غزل میں معنویت سے بھرپور کردار ہیں۔ ثروت حسین کا شعر ملاحظہ کیجیے:

ے تو سن شعر ہمارے حق میں تختِ سلیماں ہے ثروت
جن و ملائک پایہ تھامے آگے آگے چلتے ہیں

ثروت حسین اساطیری شاعری کے حوالے سے جو علامتی نظام تخلیق کرتے ہیں وہ انفرادی طور پر عام ڈگر سے قدرے ہٹ کر ہے۔ چند اور اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ے کبھی تیغ تیز سپرد کی، کبھی تحفہ گل تر دیا
کسی شاہ زادی کے عشق نے مرا دل ستاروں سے بھر دیا

ے جب شام ہوئی میں نے قدم گھر سے نکالا
ڈوبا ہوا خورشید سمندر سے نکالا

ے اس مردِ شفق فام نے اک اسم پڑھا اور
شہزادی کو دیوار کے اندر سے نکالا

ے آئینے سے نکل کے ایک پری
بازوؤں کی امان میں آئی

ے فلک سے گلستاں اترا زمیں پر
سلیماں نغمہ خواں اترا زمیں پر

ے پری زادوں نے جب وہ تخت رکھا
تو ست رنگا دھواں اترا زمیں پر

ے اس جنگ جو نے نام بتایا نہیں مگر
چہرے کی تاب و تب سے سکندر لگا مجھے

ے کبھی بلقیس کبھی شہر سبا لگتی ہے
شاعری تختِ سلیماں سے سوا لگتی ہے

ے رات گئے کیا پھول کھلا تھا بیچ ہمارے آنگن کے
یوں اترے افلاک سے تارے جیسے فوج سکندر کی

ے گزر گیا گلدستہ تھامے ہاتھ کسی شہزادی کا
شام سے کھینچ رہی ہے دنیا آئینے کے اندر کی

ے جتنے تراشیدہ پیکر تھے ابراہیم نے توڑ دیے
ثروت اس بت خانہ شب میں آنکھ لگی جو آذر کی

ثروت حسین کا تعلق اس شعری دائرے سے ہے جہاں چھوٹی چھوٹی تصویریں، کسی وضاحتی طوالت کے بغیر، اپنے اندر احساساتی اشاریت کو سمیٹ لیتی ہیں۔ غلام حسین ساجد لکھتے ہیں:

> ثروت حسین کی شاعری کا سفر مختلف تلمیحات کے حوالے سے طے پاتا ہے۔ یہ تلمیحات اپنے اندر بھرپور معنویت رکھتی ہیں اور ان کی مدد سے شاعر، اپنے وجود کی ساری کتھا بیان کرتے ہوئے، فنا ہوتی ہوئی انسانی اقدار اور ماضی کی دھند میں نہاں ہوتی ہوئی تہذیبوں کو ایک نئی زندگی کا پیام دیتے ہوئے ایک نئی منزل کی جانب رواں دواں رہتا ہے۔ ایک ایسی منزل کی

جانب جہاں آنے والے دنوں کے قافلوں کا پڑاؤ ہے۔ ۱۰

؎ چہرۂ بلقیس پر آنکھ ٹھہری نہیں
صبحِ یمن کا سماں خوب ہے اپنی جگہ
(ثروت حسین)

رؤف امیر کہتے ہیں:

یہ تلمیحات (چہرہ، بلقیس، فرات فاصلہ، دجلہ دعا وغیرہ) اپنے اندر بھرپور معنویت رکھتی ہیں ہم سمجھتے ہیں کہ ان تلمیحات کو معروف اور عام فہم ہونے میں ابھی ایک عرصہ لگے گا۔ ۱۱

افضال احمد سید کا شمار ۷۰ء کی دہائی کے ان غزل گو شعرا میں کیا جاتا ہے جنہوں نے شاعری کو بے رنگ اور سپاٹ کیفیت سے نکال کر اساطیری نظام کی ایک نئی دنیا آباد کی ہے۔ افضال احمد سید کی غزل قاری کی بھرپور توجہ کی طالب ہے کیونکہ ان کی غزل ادب کے ادنیٰ قاری کو آسانی سے سمجھ نہیں آتی۔ انہوں نے جن اساطیری حوالوں کو اپنے شعری تجربے کا حصہ بنایا ہے۔ ان اشعار کو ملاحظہ فرمائیں:

؎ کبھی نہ خود کو بد اندیش دشت و در رکھا
اتر کے چاہ میں پاتال کا سفر رکھا

؎ آتش کدہ تھا اشک ندامت فروش سے
چشمِ گریز نام سے آئینہ خانہ تھا

سراج منیرا اپنے مضمون ''یہ رنگ، اک خواب کے لیے ہے'' میں لکھتے ہیں:

افضال کی پوری کائنات فارسی کلچر سے جنم لینے والے ایک داستانی منظر میں ظہور کرتی ہے اور وہ ایک دیومالائی لہجے میں کلام کرتا ہے۔ ۱۲

؎ نشان کس کا سپہر سیاہ میں آیا
بہت جوان تھا کفش و کلاہ میں آیا

؎ بس ایک شام کا خورشید تھا کہ اسپ غریب
تہی رکاب مری خیمہ گاہ میں آیا

؎ یا پھر وہ ایک ریگ برگزیدہ سی نہر چلنے لگی
جو میں نے چوم کے پیکاں کمان میں رکھا

؎ گرفت تیز رکھی رخشِ عمر پر میں نے
بجائے جنبشِ مہمیز، نیشتر رکھا

؎ کسی کا دل ترے آتش کدے کی لوح ہوا
کسی کو پیش تری عمر گمشدہ آئی

؎ میں اس کے دل میں اک آتش کدہ بنا آیا
وہ منظر تھا سرِ شام بے شفق میرا

؎ بہار شعلہ گل سے مرے تعارف میں
کہا، یہ ہے جو آتش کدہ جلاتا ہے

افضال احمد سید کی غزل اجنبیت اور غرابت کی فضا میں پھلتی پھولتی نظر آتی ہے۔ غلام حسین ساجد کے بقول:

افضال احمد سید کی غزل زندگی کی اس بے روح بے رنگ اور سپاٹ کیفیت سے ایک نئے شعری نظام کا راستہ نکالتی ہے۔ اس کے یہاں شاعری کا ایک نیا علاقہ ہے۔ ایک نئے اساطیری ماحول کو لذتوں میں رچا بسا انوکھے امکانات کی ایک نئی دنیا لیے، مظاہر کی نئی کیفیتوں سے معمور وہ اپنی شاعری کی مدد سے سکھ، سادگی اور آزادی کی ایک ایسی فضا تعمیر کرتے ہیں، جہاں انسان کی حسی تجربوں کی سطح پر زمانے کے برق رفتار تغیر و تحرک کا خصوصی خیال رکھتے ہوئے آدمی کے باطنی اطمینان، آسودگی اور استعجاب کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ ۱۳

افضال احمد سید کے ہاں مسلم رزمیہ کی پوری روایت معنویت کی تخلیق کا اصول بن جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے عشق کی روایت جمال احسانی کے ہاں جمال احسانی ۷۰ء کی دہائی کے جمیل ترین طرز کے شاعر ہیں۔ ان کی غزل رومانیت اور محبت کے تجربات پر مشتمل ہے۔ جمال احسانی کی غزل میں اساطیری حوالے بہتات کے ساتھ نہیں آئے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

؎ پھر آج اک ستارہ جاگتا رہا
پھر آج سات آسمان سو گئے

؎ چڑھتے سورج کی پرستش ہی پہ موقوف نہیں
صبح کے وقت تو ہر چیز خدا لگتی ہے

؎ گر امتحانِ جنوں میں نہ کرتے قیس کی نقل

جمال سب سے ضروری سوال رہ جاتا

غلام حسین ساجد کے بقول:

جمال احسانی کی غزل عجائبات کے اسرار سے گزرتے ہوئے ایک داستانی فضا میں پروان چڑھتی ہے۔ یہ غزل، حزن، ہجر اور بے قراری کی فضا میں رچی بسی ہے۔ [۱۴]

سلیم کوثر کا تعلق اس شعرا کرام کی نسل سے جو کسی خاص نظریے سے وابستہ نہیں ہیں۔ ''خالی ہاتھوں میں ارض وسما'' کے شاعر سلیم کوثر کے بارے میں رؤف امیر رقمطراز ہیں:

احمد فراز کے فوراً بعد مقبول ہونے والی نسل میں سے اگر سلیم کوثر کا نام منہا کر دیا جائے تو ایک خلا پیدا ہو جائے۔ [۱۵]

زندگی کے تجربات سلیم کوثر کو بھی تاریخ اور اساطیر کے خرابوں اور آئندہ و جونیدہ خوابوں کا اسیر کیے ہوئے ہیں۔ مثلاً سلیم کوثر کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ے ہمیں اک اسم اعظم یاد ہے وہ ساتھ ہے، ہم نے
کئی بار آسمان کو ان زمینوں پر بلایا ہے

ے لا الہ الا اللہ لا الہ الا ھو
اک صدائے غیب اکثر خامشی میں ڈھلتی ہے

ے اب آسماں سے اترتی نہیں کتاب کوئی
اب اس زمیں کے لیے خواہش نمو کی جائے

ے دنیا میں تو پاتال سے باہر کا سفر ہے
منزل کبھی رستوں کے حوالے نہیں کرتا

سلیم کوثر کے ہاں جو اساطیری حوالے آتے ہیں وہ ان کی غزل کو ایک نیا اور انوکھا ذائقہ بخشتے ہیں۔ سلیم کوثر کی غزل پر بات کرتے ہوئے غلام حسین ساجد رقمطراز ہیں:

سلیم کوثر کی شاعری تمدنی تہذیب کی چکی میں آ کر پسنے والے انسانوں کے دکھ سکھ کی عکس بندی پر مامور ہے۔ اس تہذیب نے شاعر کو تنہائی کے ایک نئے مفہوم سے روشناس ہی نہیں کیا بلکہ اسے تخلیقی عمل کی ایک نئی اور انوکھی طلسمات کے روبرو لا کھڑا کیا ہے۔ جس نے اسے، اپنے منفرد احساس کی ترجمانی میں بھرپور مدد دینے کے ساتھ ساتھ، ایک نئے شعری علاقے کی تعمیر میں ہاتھ بھی بٹایا ہے۔ [۱۶]

۷۰ء کی دہائی میں سلیم کوثر کے علاوہ صابر ظفر کی غزل میں تجربات و مشاہدات کی کثرت اور تنوع ہے۔ اپنے اردگرد کے ماحول اور پھر دنیا بھر میں پھیلے ہوئے مسائل کو انہوں نے اپنی غزل کا موضوع بنایا اس اظہار میں ذات، سماجیات، عمرانیات، اقتصادیات اور اساطیر سے متعلق افکار و خیالات شامل ہیں۔ مثلاً:

ے میں آسماں سے پاتال میں اتارا گیا
مگر جدائی کا اک پل نہیں گزارا گیا

ے جب اس کے سامنے سقراط کا حوالہ دیا
تو اس نے بڑھ کے مجھے زہر کا پیالہ دیا

ے ہمیشہ رہتے ہیں مریخ کے اثر میں اگر
بنے بنائے ہوئے وہ گھرانے ٹوٹتے ہیں

ہندو دیومالا میں مریخ (منگل) کے زیر اثر پیدا ہونے والے لوگوں کے متعلق عام رائے یہ ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ تفکرات میں گھرے رہیں گے۔ صابر ظفر کے درج بالا شعر میں ہندو دیومالا کے اسی تصور کی طرف اشارہ ہے۔ صرف یہی نہیں ہندو دیومالا میں تقریباً تمام سیاروں کے متعلق مختلف نظریات ملتے ہیں اور صابر ظفر کے ہاں یہ تصورات اشعار کا روپ دھارن کرتے نظر آتے ہیں اسی غزل کے چند اور اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ے ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا، ہو بھی سکتا ہے
زحل کے روٹھنے سے آستانے ٹوٹتے ہیں

ے نصیب ہوتا نہیں قرب سنبلہ کا جنہیں
زمیں پر گر کے وہ سب آشیانے ٹوٹتے ہیں

ے بُرج مرا سنبلہ، تیرا ستارہ ہے کیا
تیری کشش کیوں مری روح کے اندر نہیں

ے مرے اندر تو تھے ہاروت ماروت
وہ چہرہ صورتِ زہرہ نہیں تھا

ے بنا لیا ہے جو ہمراز فرِ عقرب کو

مرے ستارے نے دشوار کام سیکھ لیا

صابر ظفر وہ شاعر ہیں جن کی غزل میں سوچ بچار، غور وفکر اور تجزیے کا عنصر ایک خوشگوار تخلیقی تجربے کے طور پر نظر آتا ہے۔ چنانچہ صابر ظفر کے ہاں جو اساطیری حوالے آئے ہیں وہ زندگی اور زندگی سے جڑی پیچیدگیوں کی فلسفیانہ توجیہہ کرنے کی کوشش ہے۔ چند مزید اشعار ملاحظہ فرمائیں:

- پرانی داستانوں کا بیاں چوپال کے اندر
  جنہیں سن کر چلے جاتے تھے ہم پاتال کے اندر
- چلو اس جل پری کا حال انھی سے پوچھتے ہیں ہم
  سنہری مچھلیاں آتی تو ہوں گی جال کے اندر
- کھویا ہوا بدن کوئی آؤ کریں تلاش
  پاتال میں اترتا ہوا نردبان ہے
- ہم اس کو دیکھ رہے ہیں تمہاری آنکھوں سے
  جو تم نے جلوہ سیر کوہ طور دیکھا ہے
- وہ جس میں صورت یوسف کسی کو پھینکا جائے
  مرے علاقے میں اے کاش ہو نہ ایسا کھو

صابر ظفر کی شاعری ابتدا سے نامعلوم تک ایک طویل ادبی منظر نامہ ہے جس کا دورانیہ تین دہائیوں سے زائد عرصے پر محیط ہے۔ پروفیسر ریاض صدیقی فرماتے ہیں:

> روایت سے شعوری طور پر بغاوت اور بغاوت اور انحراف کا جو سلسلہ غالب سے شروع ہوا اس کی نشوونما کا تسلسل اب تک جاری ہے، جس کی کارفرمائی صابر ظفر کی شاعری میں ابتدا سے لے کر اب تک دکھائی دیتی ہے۔ ۱۷

دیوار آب، پانی پر بچھا تخت پری زاد کے خالق محمد اظہار الحق کو ڈاکٹر حامد بیگ نے منفرد ''لفظیات کا شاعر'' قرار دیا ہے۔ ان کے ہاں اساطیری رویوں کا ہمعصر سیاسی رویوں سے موازنہ بھی ملتا ہے۔ محمد اظہار الحق نے اسلامی اساطیر کے ذریعے اپنی غزل میں انفرادیت پیدا کی ہے۔

خاور اعجاز فرماتے ہیں:

اظہار الحق کی غزل اسلامی تہذیب اور اس کے عروج وزوال سے ابھرنے والی ایک مسلسل داستان ہے۔ اس کے ہاں طلسماتی افسانوی رنگ غالب اور گمشدہ تہذیب کو تاریخ کے جھروکے سے دیکھنے کا عمل نمایاں ہے۔ ۱۸

محمد اظہار الحق کے کلام میں سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جن میں مذکورہ بالا اساطیر کو اپنے شعری تجربے کا حصہ بنایا گیا ہے۔

- پروں کی پھڑ پھڑاہٹ تھی زمانے زیر پا تھے
  نہیں معلوم برزخ تھا کہ میں جی کر اٹھا تھا
- وہیں مٹی مری اظہار گوندھی جا رہی تھی
  ازل کا اولین دربار، جو بھی تھا، رہیں تھا
- پروں کی ارغوانی چھاؤں پھیلائی تھی سر پر
  بہشتی نہر کا پانی مسافر کو دیا تھا
- یہ کس بخت آزما کا رخ بخارا کی طرف ہے
  بہت اوپر ہما کا رخ بخارا کی طرف ہے
- مجھے شاہی نہیں منظور لیکن
  ہما! سر سے ترا سایہ نہ جائے
- کہیں دور سے اڑ کر ایک غالیچہ آتا ہے
  یا شہزادہ یا لال پری کوئی آئے گا
- چھتوں پر اترتی تھیں پریاں کبھی
  یہ قصہ کئی خاندانوں میں تھا
- زمیں کو علم نہیں کس طرف رواں ہوں میں
  حساب سر پر لیے سات آسمانوں کا
- زمیں والوں سے شاید صلح کرنا چاہتے ہیں
  فرشتے آسمانوں سے اترنا چاہتے ہیں

طارق ہاشمی فرماتے ہیں:

> محمد اظہار الحق جب اشعار کے پیرائے میں داستان سرا ہوتے ہیں تو اردو غزل نہایت نئے اور

منفرد لفظیات کے تجربے سے گرزتی ہے۔ ۱۹

محمد اظہار الحق کا درج ذیل شعر ملاحظہ فرمائیں:

محبت سے مجھے بازار میں کیا مل سکے گا
مجھے اس غار میں سوئے زمانہ ہو رہا ہے

قمر جمیل فرماتے ہیں:

محبت بھی اصحاب کہف کے غار میں سلا دیتی ہے۔ مذہبی اساطیر کو بھی اظہار الحق عشق کی حکایت میں، محبت کے قصے میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہاں اصحاب کہف ہی نہیں ثمود و عاد کے قصے بھی ہیں۔ ۲۰

ظفر چشتی محمد اظہار الحق کی اساطیری غزل پر بات کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

محمد اظہار الحق کی شاعری کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ داستانوں اور اساطیری فضا تیار کرتے ہیں اور اس مقصد کے لیے فوق الفطرت عناصر سے مدد لیتے ہیں، غار، پتھر، دریوزہ گر، خاک زادے اور سربریدہ سواران کے ہاں جادوئی قسم کا ماحول پیدا کر دیتے ہیں۔ ۲۱

اس حوالے سے محمد اظہار الحق چند اور اشعار ملاحظہ فرمائیں:

سرِ شام کتنی امید کیسا غبار تھا
مگر اس غبار میں سربریدہ سوار تھا

یہاں لعلِ خاک میں اور خاک سروں پہ تھی
یہاں سر کٹے ہوئے تھے یہ کیسا دیار تھا

ایوب خاور کی غزل بھی اسی نئے منظر نامے کی غزل ہے۔

ایوب خاور کی غزل میں اساطیری اسلوب اپنی نسل کے غزل گوؤں کی مجموعی آب و تاب میں ایک پرتو کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۲۲

غلام حسین ساجد فرماتے ہیں:

ایوب خاور کی غزل اس عہد کے بنیادی مسائل اور رویوں کا بھرپور احاطہ کرتے ہوئے ابدی حقیقت کے مطالعے پر کاربند ہے اور اس نے سماج کی ہر دم متغیر صورت حال کی عکس بندی کرتے ہوئے روایت اور مٹتی ہوئی انسانی تہذیبوں کے حوالے سے ایک ایسی اقلیم اور شعری اساطیر کی بنیاد رکھی ہے جو شاعر کے خوابوں کی دکھ کی دھند میں گھلنے سے محفوظ رکھے گی۔ ۲۳

اب کیا اونچے بادبان پر خواب ستارہ چمکے
آنکھیں رہ گئیں ساحل پر اور ہاتھ سمندر بیچ

بجھانے والے نے خاور بجھا دیا ہے چراغ
یہی ٹھہرنے کی ساعت، یہی فرار کی ہے

ان کے علاوہ ۷۰ء کی دہائی میں تین اور نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ محمد خالد، غلام حسین ساجد اور خالد اقبال یاسر، محمد خالد کی غزلیں ابھی تک کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئیں اور جو مختلف رسائل میں چھپی ہیں ان کی تعداد بھی ایسی نہیں کہ سب کو اکٹھا کر کے کتابی شکل دے دی جائے۔ اس کے باوجود جدید غزل کے ناقدین محمد خالد کی غزلوں کو دوسرے سینکڑوں شعرا کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ غلام حسین ساجد کے خیال میں:

اس توقیر کا ایک ہی سبب ہے۔ غزل کہنے اور غزل پر کام کرنے کے سلسلے میں محمد خالد کی سخت کوشی۔ غزل کہتے ہوئے محمد خالد کی نگاہ موجود کی فکری روایت پر ہوتی ہے، نہ مقبول عام اور پسندیدہ موضوعات پر نہ ہی وہ پیش پا افتادہ حقیقتوں اور غیب سے خیال میں در آنے والے مضامین کو غزلیہ آہنگ کا پابند کر کے مطمئن ہو رہتا ہے۔ ''کیمیا گر'' کی طرح اس کے یہاں ہر خیال کو فکر کی کٹھالی میں گلنا پڑتا ہے اور اس کی فکری انچ سے متصل ہو کر اردو کی خوش فکر غزلیہ روایت سے آمیخت ہو کر کبھی مانوس اور کبھی نامانوس مگر ہمیشہ یاد رہنے والے آہنگ میں ڈوب کر ہی ظہور پانے کی راہ ملتی ہے۔ ۲۴

۷۰ء کی دہائی میں اردو غزل کو رزمیہ آہنگ سے آشنا کرنے والے نام خالد اقبال یاسر اور غلام حسین ساجد کے ہیں۔ خالد اقبال یاسر کی غزل کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ہاں اساطیری حوالے بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

نہ صرف بنیاد ہیں بلکہ اس خمیر سے اس نے اپنی غزل کی فضا ہی کو بدل دیا ہے۔ ۲۵

غزل میں داستانوی و دیومالائی عناصر کو معاصر طبقاتی تضادات سے ہم آہنگ کرنے کو چاہے تو ترقی پسندی کہا جائے لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ موجودہ معاشروں میں بھی ''رعونت'' کا یہ تسلسل رکا نہیں ہے۔ ''دربار کی روایت پورے معاشرے میں کارفرما ہے۔'' ۲۶

زمانے کی بے نیاز نظروں سے کب گرے گا
کلس لرزتا ہے اس طرح جیسے اب گرے گا

دربار، رزم گاہ اور داستان کی تکون میں رہتے ہوئے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دربار کی امیجری یا لفظیات میں ہمیں شاعر کی عقیدہ پرستی بھی بہت واضح شکل میں نظر آتی ہے اور ہمیں پتہ چلتا ہے کہ شاعر اہل دربار یا اہل زر کی بجائے کسی دوسرے گروہ کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑ رہا ہے، اہل فقر کا گروہ بھی ہوسکتا ہے اور اہل عمل بھی جن کا اہل دربار کے ساتھ موافقت کا رشتہ ہرگز نہیں ہے۔ ۲۷

؎ رستے میں رات آتی تو نمدہ بچھا لیا
گھوڑے کی زین اتار کے تکیہ بنا لیا

؎ فضا بھی کچھ سازگار ہے سازشوں کی خاطر
اور اس پہ یاسر کچھ اہل دربار بھی مخالف

؎ ہم اپنے بھی پابند نہیں تھے کبھی یاسر
اٹھ آئے کہ دربار کے آداب بہت تھے

محمد خالد نے خالد اقبال یاسر کی غزل میں فقر و غنا کے عناصر دریافت کئے ہیں لیکن غلام حسین ساجد اس ضمن میں یوں رقمطراز ہیں:

محمد خالد نے خالد اقبال یاسر کی غزل میں فقر و غنا کے عناصر دریافت کئے ہیں اور شاید ہوں بھی مگر میرے ذاتی خیال میں یاسر کی غزل میں بار بار جھلک دکھانے والے تیغ آزما کو فقر سے کچھ زیادہ نسبت نہیں۔ مجھے تو وہ ایسا سورما جان پڑتا ہے جو ایک سلطنت کی بنیاد رکھنے کے ابتدائی مراحل سے گزر کر رہا ہے۔ ۲۸

؎ مبارزت طلبی میں ہے زندگی میری
جو کارزار سے پسپا کبھی ہوا تو گیا

؎ حیران ہوں کہ مجھ سے ہی میدان چھوڑ کر
اس کو مری شکست کا ڈر چھوڑتا نہیں

اساطیری غزل کے تناظر میں غلام حسین ساجد کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ غلام حسین ساجد نے غزل میں مابعد الطبعیاتی گہرائی پیدا کی ہے۔

شمس الرحمان فاروقی فرماتے ہیں:

آج کی غزل میں مابعد الطبعیاتی ٹھاٹ کم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مابعد الطبعیات میں کھل

کھیلنے کی گنجائش نہیں۔ لہٰذا غزل میں یکسانی اور ایک طرح کی بے لطف فلسفیانہ کیفیت پیدا ہو جانے کا خوف رہتا ہے۔ آج کا شاعر خود پر ہنسنا نہیں جانتا لیکن وہ غیر ضروری سنجیدگی اور لہجے کے بھاری پن سے گھبراتا ہے۔ غلام حسین ساجد کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے سنجیدہ لہجہ اختیار کیا ہے لیکن اس میں خشکی یا بوجھل پن کا نام نہیں۔ ۲۹

غلام حسین ساجد پرانی تہذیبوں کے کھنڈر سے نئی تہذیب کی دریافت کرتے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ اساطیر کا تعلق تہذیب سے نہایت گہرا ہوتا ہے۔ اس لیے اساطیر تہذیبی ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اور غلام حسین ساجد کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے، بقول عامر سہیل:

غلام حسین ساجد نے اساطیری غزل کے تناظر میں ماضی کے دریچوں سے حال میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ ۳۰

اشعار ملاحظہ فرمائیں:

؎ الجھ رہا ہے کوئی ستارہ طلسم اصطخر و نینوا سے
کہ ربِّ رع کے مقابلے میں ہوا ہے جو سرخرو وہی ہے

؎ یہ خواب ہوتے ہوئے صحیفوں کے پھول میرے لیے ہیں لیکن
زمین دل پر یہ آئتوں کا نزول ایک دہر کے لیے ہے

؎ پریشاں کس لیے ہوں محبت بلقیس کی خاطر
یمن میری ریاست ہے نہ ملک شام ہے میرا

؎ رات گئے تک پوجا کی تھی میں نے میگھا دیوی کی
صبح ہوئی تو ایک انوکھی دھوپ تھی میرے دامن میں

؎ چراغ کو ہم سفر کروں گا
اور ایک پاتال سر کروں گا

؎ طلسم عشتا روسامری سے
میں کوئی اقلیم سر کروں گا

؎ ذرا سا دائیں مڑیں تو شہر سبا پڑے گا
اور اس طلسمی نگر سے آگے سوا درے ہے

؎ گلی کوچوں کی رونق بڑھ گئی ہے

فقیر آئے ہیں کچھ شہر سبا سے

مندرجہ بالا اشعار غلام حسین ساجد کے پہلے مجموعہ کلام موسم سے لیے گئے ہیں اور ان غزلیات میں جہاں گزرتی رتوں کی داستان سنائی ہے۔ ''رہیں گئے وقتوں کی ایک بھولی بسری شعری صنف اظہار ''رتو سنہار'' کے گمشدہ ذائقے کو بھی اردو شاعری میں دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔''۳۱

ڈاکٹر نجیب جمال فرماتے ہیں:

غلام حسین ساجد کئی لحاظ سے اپنے معاصرین شعرا سے کسی قدر مختلف بھی ہے ایک تو اس کا ہر شعری مجموعہ موضوعاتی اعتبار سے بھی الگ مزاج رکھتا ہے اور دوسرے وہ حسب ضرورت اور حسب ذوق اپنے لہجے کی حلاوت و ملاحت میں کمی بیشی کر لیتا ہے..... اس کے ہر مجموعے کے مضامین اور اسالیب مخصوص تجربیت کے حامل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے قاری سے ہر مرتبہ ایک نئے زاویے اور ایک نئی تیاری کے ساتھ اپنی شاعری کے مطالعے کا تقاضا کرتا ہے۔ ۳۲

لیکن جہاں تک اساطیری غزل کا تعلق ہے غلام حسین ساجد کے ہر مجموعہ کلام میں چاہے وہ موسم ہے، عناصر، کتاب صبح، آئندہ یا معاملہ، دیومالائی عناصر کسی نہ کسی صورت جگہ بناتے نظر آتے ہیں۔

عناصر میں شامل غزلیات میں جادوگر، طلسم سامری، ساتواں در، طلسمی دائرے، طلسمی کنجیاں، آہنی مخلوق، آسمانی حور، دست غیب جیسے جادوئی اور دیومالائی عناصر ملتے ہیں اور ساتھ ہی واحد متکلم کے صیغے کے ساتھ سورما..... یہ سورما اپنے عہد میں جیتا ہے اور کہیں خدا کے اوتار میں ڈھلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ۳۳

عناصر کی غزلیات کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

؎ اُتاروں گا ابھی اک آہنی مخلوق میداں میں
اور اس کے بعد بھی اک فوج ہے تیار مٹی کی

؎ کہیں تکنے نہیں دیتیں تھکے ہارے سفینے کو!
الگ اک روز کر دوں گا میں ان لہروں کو پانی سے

مرزا حامد بیگ آگے چل کر کہتے ہیں:

ساجد کی یک کیفیتی غزلیں اپنے اندر ایتھنز (یونان) کے عظیم ڈرامہ نگار ایس کائی لس کے ''پرومی تھیوس زنجیر بستہ'' کا سا دبدبہ سمیٹے ہوئے ہیں۔ ۳۴

پرومی تھیوس یونانی دیومالا کا کردار جس نے انسانوں کی بھلائی کے لیے آگ کی چوری کی تھی۔ غلام حسین ساجد کی ہمدردیاں اسی کے ساتھ نظر آتی ہیں۔

؎ آسماں ہے ایک شمع نور سے روشن اگر
میری خلعت آئنہ ہے، میرا زیور آگ ہے

؎ میں تزک و احتشام سے بڑھوں گا شہر کی طرف
کہ اب مرے جلو میں ہے سوار میری آگ کا

عناصر میں سے ہی چند اور اشعار ملاحظہ فرمائیں:

؎ لوگ ان ستاروں کو دیوتا سمجھتے ہیں
اور میں پجاری ہوں نیک نام مٹی کا

؎ کمال اپنا دکھائے گا طلسمی آئنہ ساجد
کہ رب درکار ہے اک خواب کی تعبیر مٹی کو

؎ برستے ہیں ابھی تک نینوا پر مرے بادل بھی
ترستا ہے اگرچہ آج بھی خرطوم پانی کو

؎ آب حیواں سے اسے رکھوں گا زندہ صبح تک
آج بھی تکمیل پائے گا ہنر پانی کے ساتھ

؎ میرے کوزے کو نکھارا ہے شراب و شہد نے
میری شمشیر سلیمانی کا جوہر آگ ہے

؎ سحر قائم ہے ابھی تک محبت زرتشت کا
آج بھی ایک تیز خوشبو سے معتبر آگ ہے

؎ کسی عشتار نے پھونکا ہے افسوں
کہ جل اٹھے ہیں تارے پھر ہوا سے

اسی طرح کتاب صبح، آئندہ اور معاملہ کی غزلیات میں سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں

جن میں کسی نہ کسی اساطیری حوالے کو غلام حسین ساجد نے اپنے شعری تجربے کا حصہ بنایا ہے:

؎ چراغ خانہ اصطخر و نینوا کے بیچ
شگفت بصرہ و بغداد کر رہا ہوں میں

؎ دھرا ہوا ہے مرے طاقچے میں کیا کیا کچھ
عصا ہے، تختِ سلیماں ہے اور جامِ جم

؎ کھنچتا ہے کفر کی جانب طلسمِ سامری
اور ہم کو بھی پسند آیا موسمِ دہر کا

؎ کسی نے تختِ سلیمان پر جگہ پائی
کسی نے خاک نشینوں میں اپنا نام کیا

؎ سوئمبر میں کہیں باہر سے کوئی آ نہ جائے
قبیلے میں تو مجھ ایسا جواں کوئی نہیں ہے

؎ اور کتنی دیر تک رکھوں گا دنیا پر نظر
کب تلک اپنے جلو میں جامِ جم رکھوں گا میں

؎ سلطنت برباد ہوتی ہے فسادِ خلق سے
ذکر آتا ہے صحیفوں میں کہیں سومیر کا

؎ کیا ہے نارِ جہنم کو اس قدر مہمیز
کہ ناز کرتی ہے آلِ ثمود بھی مجھ پر

؎ اسی کے دم سے منور ہے معبدِ عشتار
جو چشمِ شہرِ سبا کا ستارہ کرتی ہے

؎ اک اور رزم کی بنیاد رکھی جائے گی
جو آ گیا کبھی ملکِ سبا ہمارے بیچ

؎ سب اپنے اپنے طریقے سے جاں چھڑکتے ہیں
کہیں سے آیا ہے اک دیوتا ہمارے بیچ

؎ وہ جس کو ملکِ اساطیر سے نکالا تھا

دمک رہی ہے وہی مہ جبیں ہمارے بیچ

؎ سجی ہے تختِ سلیماں سے خواب گاہ اگر
دھری ہے صحنِ چمن میں بھی ماہتابی سی

؎ ہاں! کبھی آباد تھا اس گھر میں قیس عامری!
اب وہ اک مدت سے دشتِ نجد کا باشندہ ہے

؎ میں خوش نہیں ہوں فقط سلطنت کی وسعت پر
مرے حضور میں بلقیس سے حسین بھی ہیں

؎ بابل و رے سے تعلق ہے نہ کچھ لبنان سے
ایک ان دیکھی محبت ہے مجھے کنعان سے

؎ صبح ہوتے ہی سمندِ قوس پر ہو کر سوار
برجِ عقرب تک پہنچتا ہوں صفِ میزان سے

؎ مری نگاہ بھی ہے تاج و تخت پر ساجد
مجھے بھی حسنِ زلیخا سے کوئی کام نہیں

رفیق سندیلوی غلام حسین ساجد کی غزل پر بات کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ساجد کی دنیا انسانی معاشرت اور سماجی معاملات کی نہیں۔ موسمیات، مظاہرِ فطرت اور ماقبل تاریخ کی دنیا ہے۔ ایسی دنیا متخیلہ کی کرشمہ سازی کے بغیر خلق نہیں ہو سکتی۔ سڈنی کا نظریہ ایجاد بھی یہی تھا کہ شاعر وہی ہوتا ہے جو موجودہ دنیا سے بہتر دنیا ایجاد کر سکے۔ ساجد نے اپنے رومانی تخیل کے زور پر بہت بہتر نہ سہی، ایک الگ دنیا ضرور ایجاد کی ہے۔ ۳۵

اُردو غزل میں اساطیری علائم کا استعمال مذکورہ بالا شعرا کے علاوہ بعض دیگر شعرا کے ہاں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ جیسے اجمل نیازی، اعزاز احمد آذر، اسعد بدایونی، حسن عباس رضا، لیکن ان میں جو آواز باقیوں سے بلند سنائی دیتی ہے وہ علی اکبر عباس کی آواز ہے۔

علی اکبر عباس شاعری کے اسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے لیکن اس گروہ سے قدم ملا کر چلتے ہوئے بھی ان سب سے الگ نظر آتے ہیں۔ علی اکبر عباس کا پہلا مجموعہ کلام ''برآبِ نیل'' ہے اور اس میں جو اساطیری حوالے ملے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

جنگل میں پریوں کے ڈیرے شہروں میں جنات
شہروں کا ہر دن پاگل ہے جنگل کی ہر رات

چاند سفر میں ہے کولہو پیل رہا ہے
سورج بچہ گیند زمیں سے کھیل رہا ہے

بوڑھی شام نے بالوں میں مہندی نکھرائی
کڑیل دن بھی ہر ہر رت ٹھیل رہا ہے

کسی سورج کا ٹکڑا توڑ لائیں
زمیں کا جسم ٹھنڈا پڑ رہا ہے

یہ اتفاق زمانہ ہے یا طلسم، چاک ساحروں کا
کہ سرخ آندھی کے بعد شہروں میں سبز پریاں اتر رہی ہیں

غضب کی آگ مرے خاک داں سے نکلی ہے
یہ طور زادِ غبارِ گماں سے نکلی ہے

انتظار کن میں ہیں عالم کئی ٹھہرے ہوئے
اور ہیں افلاک بالائے فلک بہتے ہوئے

فرار طور پہ میں بن بلائے پہنچا ہوں
عصا وہ دے کہ نہ دے، نور ہاتھ دے گا

جنت سے دانے کی چوری بھگت نہ پاتے تھے
کون چرا لایا ہے جہنم سے خونخوار دھواں

زہر یا منزل جو تھی کوہ ندا بنتی گئی
میرے چاروں سمت گنبد کی فضا بنتی گئی

مندرجہ بالا اشعار برآب نیل اور درنگاہ سے کی غزلیات میں سے لیے گئے ہیں۔ اور یہ مجموعہ کلام علی اکبر عباس کے کسی بھی دوسرے ہم عصر کے ساتھ رکھ کے پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ علی اکبر عباس کی آواز دوسروں سے الگ پہچانی جاتی ہے تو اس کی وجہ ان کا مجموعہ کلام رچنا ہے۔

غلام حسین ساجد کے بقول:

> رچنا کی شاعری میں جس مٹی کی خوشبو رچی بسی ہے وہ ان علاقوں سے متعلق نہیں کہ جن کے بارے میں ہمارا علم اساطیری قصوں یا داستانی حوالوں تک محدود ہے..... علی اکبر عباس کی شاعری میں سومیری یا اسلامی عہد کی پرشکوہ اور مفتوحہ مملکتوں کا کوئی حوالہ نہیں، نہ ہی وہ مصلوب فکری ورثے کا نوحہ گر ہے..... اس کی شاعری کا لینڈ سکیپ اور موضوع تو اسی خطہ پاک کا یہی سرسبز علاقہ یعنی سرزمین پنجاب ہے اور اس کے شعری کردار، ماحول اور موضوعات اسی سبز ستارے سے متعلق ہیں۔ ۳۶

۷۰ء کی دہائی میں ان شعرا کے علاوہ شاعرات بھی اپنے حصے کا کام کرتی نظر آتی ہیں جیسے شاہدہ حسن، فاطمہ حسن اور پروین شاکر ان شاعرات نے اُردو غزل کو نسوانی جذبات سے ہم آمیز کیا ہے۔ مجموعی طور پر ان شاعرات کے ہاں دیومالائی عناصر کا قابل قدر حوالہ نہیں ملتا۔

داستانوی اور دیومالائی قصوں کو بیان کرنے کا تجربہ ۷۰ء کی دہائی میں ایک اجتماعی اور مشترکہ طرز احساس کے ساتھ نظر آتا ہے۔ غزل میں دیومالائی عناصر ۶۵ء اور ۷۱ء کی جنگوں کے بعد پیدا شدہ صورتحال سے تخلیق کاروں کی ذہنی افتادہ کا حصہ بنے اور شعرا نے داستانوی عناصر کے ذریعے اپنے گمشدہ ماضی کا تہذیبی آموختہ کر کے لمحۂ موجود کی صورتحال کا جائزہ لینے کی سعی کی اور طارق ہاشمی رقمطراز ہیں:

> ۷۰ء کی دہائی میں غزل کا دیومالائی علامات کی طرف رجوع اس لحاظ سے تو اہم ہو سکتا ہے کہ یہ تخلیق کاروں کی اپنی نفسیاتی تسکین یا ذہنی استحکام کا باعث نہیں لیکن اس حقیقت سے گریز ممکن نہیں کہ فی زمانہ ہمارا عام سماجی شعور ان کی معنویت کی تفہیم سے عاری ہے چنانچہ اساطیری غزل اسلوب کی اجنبیت کے باعث اپنے قاری کو بے مطلب تخلیق ہونے کا احساس بھی دلاتی ہے۔ ۳۷

بحیثیت مجموعی غزل میں اساطیری عناصر اور داستانوی فضا کے تجربات اس صنف کو اسلوب اور زبان کی سطح پر کئی جہتوں سے متعارف کروانے کی کوشش ہے اور اس رجحان نے بعد میں آنے والوں کو زندگی کے متنوع مسائل کے احاطے کے لیے نئی راہیں اور امکانات پیدا کیے ہیں۔ ۷۰ء کی دہائی میں جو غزل لکھی گئی قدیم داستانوں کے عناصر ہی دیکھنے کو ملتے ہیں، مزید لوک داستانوں کے ساتھ ساتھ تہذیبی علامتوں کا ذخیرہ بھی نظر آتا ہے۔ تہذیب کے ساتھ جوڑے

رکھنے کی یہ صلاحیت انسان کے ذاتی تجربے کو اجتماعی تجربے میں ڈھال دیتی ہے۔ کسی بھی زمانے کے ادب میں اساطیر، دیومالائیں محض تفریح طبع یا جذبات کی تطہیر کے لیے نہیں ہوتیں بلکہ انسان معلوم سے نامعلوم کا سفر اساطیر کے ذریعے طے کرتا ہے۔ ولی سے لے کر اب تک غزل کی جو روایت چلی آ رہی ہے۔ اُس روایت میں شعرا نے اساطیر کو اپنے ماحول اور صورتحال کے مطابق اپنایا اور ۷۰ء کی دہائی تک آتے آتے شعرا نے اپنے ادھورے پن کو دور کرنے کے لیے ماضی کے خزینوں کا سفر شروع کیا اور ایک مضبوط اور تازہ ترین روایت کی تشکیل میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

پاکستانی اردو غزل کا وہ لب ولہجہ، جسے بعد میں ستر کی دہائی کے ان شعرا کا پہچان قرار دیا گیا جسے ''اساطیری غزل'' کا نام دیا گیا۔ اپنی موجودگی اور انفرادیت کا احساس دلا چکی ہے اور غزل میں قدیم تہذیبی زمانوں کی تلاش اور ان کے اسرار و رموز کو حال تک کھینچ لانے کے آغاز کی بڑی وجہ سقوط مشرقی پاکستان، ایک نئے ''پاکستان''، کا وجود میں آنا تھا۔ شعرا کے اپنی ذات اور ملکی خلا کو ماضی کی دوسری روایتوں سے پر کرنے کی کوشش کی۔ قدیم تہذیبوں کی طرف لوٹنا اپنے آپ کو دوبارہ دریافت کرنے اور حال کے بے جان وجود میں ماضی کی روح پھونک کر زندہ کرنے کی سعی نہیں اور کیا ہے؟ پاکستانی معاشرے میں غزل میں اساطیری حوالوں کا ملنا ایک قدرتی بات ہے۔ اساطیری غزل کے داعی شعرا اپنے حصے کا کام کم وبیش مکمل کر چکے ہیں اور کچھ ابھی کر رہے ہیں۔

اُردو غزل رواں عہد میں یا اس کے بعد کیا صورتحال اختیار کرتی ہے۔ اس کے بارے میں قیاس آرائیاں بہت کی جا سکتی ہیں لیکن اس کا فیصلہ آنے والے وقت پر چھوڑ دیا جائے تو مناسب ہوگا۔

حوالہ جات

۱۔ محمد خالد، دیباچہ نئی پاکستانی غزل، منتخب و مرتبہ، غلام حسین ساجد (لاہور: خالدین، ۱۹۸۱ء)، ۹۔

۲۔ غلام حسین ساجد، ''پاکستانی اردو ادب کے ساٹھ سال''، *ادب لطیف* ۱۱ (نومبر ۲۰۰۷ء): ۵۶۔

۳۔ سراج منیر، ''یہ رنگ اک خواب کے لیے ہے''، *معاصر* ۲ (اگست ۱۹۸۳ء): ۴۵۔

۴۔ غلام حسین ساجد، ''نقش کوئی کمال کا''، *انگارے* (اگست ۲۰۰۳ء)، ۲۳۔

۵۔ غلام حسین ساجد، ''اردو غزل بیسویں صدی میں''، *آئندہ* (دسمبر ۲۰۰۰ء): ۱۰۱۔

۶۔ طارق ہاشمی، دیباچہ *اردو غزل: نئی تشکیل* (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۸ء)، ۳۰۲۔۳۰۱۔

۷۔ انور سدید، ''۱۹۷۵ء کی غزل''، *اوراق* ۱۲۔۸، ۷ (جولائی، اگست ۱۹۷۶ء): ۱۴۶۔

۸۔ ضیاء الحسن، مرتبہ *گمشدہ ستارہ* (لاہور: اظہار سنز، ۲۰۰۲ء)، ۲۱۔

۹۔ ہاشمی، *اردو غزل: نئی تشکیل*، ۳۰۳۔

۱۰۔ خالد، *نئی پاکستانی غزل*، منتخب و دستخط، ۲۹۔

۱۱۔ رؤف امیر، ''پاکستانی غزل کے چند زاویے''، *ادبیات* ۱۲، ۱۱، ۱۰ (اکتوبر ۱۹۸۹ء): ۲۷۸۔

۱۲۔ منیر، *یہ رنگ اک خواب کے لیے ہے*، ۴۵۹۔

۱۳۔ ساجد، *نئی پاکستانی غزل*، منتخب و دستخط، ۴۱۔

۱۴۔ ساجد، *نئی پاکستانی غزل*، منتخب و دستخط، ۴۷۔

۱۵۔ امیر، *پاکستانی غزل کے چند زاویے*، ۲۶۷۔

۱۶۔ ساجد، *نئی پاکستانی غزل*، منتخب و دستخط، ۵۹۔

۱۷۔ ریاض صدیقی، ''نامعلوم سے مکالمہ''، *انگارے* ۲۹ (مئی ۲۰۰۵ء): ۶۴۔

۱۸۔ خاور اعجاز، *نئی پاکستانی اردو غزل* (۱۹۷۰ء کی دہائی کے حوالے سے) (لاہور: ابلاغ پبلشرز، ۲۰۰۱ء)، ۶۷۔

۱۹۔ ہاشمی، *اردو غزل: نئی تشکیل*، ۳۱۰۔

۲۰۔ قمر جمیل، دیباچہ *پری زاد* (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء)، ۱۳۔

۲۱۔ ظفر چشتی، ''محمد اظہار الحق کی پری زاد''، *ادب و ثقافت* (جولائی ۲۰۰۶ء): ۴۸۔

۲۲۔ ہاشمی، *اردو غزل: نئی تشکیل*، ۳۱۲۔

۲۳۔ ساجد، *نئی پاکستانی غزل*، منتخب و دستخط، ۷۷۔

۲۴۔ ساجد، ''نقش کوئی کمال کا''، ۲۷۔

۲۵۔ ظفر اقبال، ''خالد اقبال یاسر کی شاعری''، *میچیان* ۳۔۵ (۲۰۰۱ء): ۳۳۸۔

۲۶۔ وزیر آغا، فلیپ، *گردش* [مجموعہ کلام خالد اقبال یاسر] (اسلام آباد: ابلاغ، س ن)، ۷۔

۲۷۔ محمد خالد، ''دروبست کا شاعر، خالد اقبال یاسر''، *میچیان* ۳۔۵ (۲۰۰۱ء): ۳۴۲۔

۲۸۔ غلام حسین ساجد، *دروبست کا جواز* (لاہور: اورینٹ پبلشرز، ۱۹۹۶ء)، ۹۰۔

۲۹۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ''عناصر، غلام حسین ساجد کے حوالے سے''، *آئندہ* ۳۔۱۲ (نومبر، دسمبر ۱۹۹۸ء): ۵۶۔

۳۰۔ عامر سہیل، دیباچہ *کتاب صبح* (لاہور: سارنگ پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء)، ۲۰۔

۳۱۔ مرزا حامد بیگ، فلیپ *موسم*، غلام حسین ساجد (لاہور: خالدین، ۱۹۸۵ء)۔

۳۲۔ نجیب جمال، ''معاملہ کی غزلیں''، *انگارے*، ساتویں کتاب (ملتان: ۲۰۰۲ء)، ۷۔

۳۳۔ حامد بیگ مرزا، *ابتدائیہ عناصر*، غلام حسین ساجد (لاہور: اورینٹ پبلشرز، ۱۹۹۳ء)، ۲۳۔

۳۴۔ مرزا، عناصر، ۲۳۔
۳۵۔ رفیق سندیلوی، ''غلام حسین ساجد کی غزل''، آفاق خاص نمبر (س ن)۔
۳۶۔ غلام حسین ساجد، ''رس رچنا کا''، شمام و سحر ۵۔۱۸ (مئی ۱۹۹۵ء): ۸۔
۳۷۔ ہاشمی، اردو غزل نئی تشکیلیں، ۳۱۹، ۳۱۸۔

مآخذ

آغا، وزیر۔ فلیپ گرد پش۔ مجموعہ کلام خالد اقبال یاسر۔ اسلام آباد: ابلاغ، س ن۔
اعجاز، خاور نئی پاکستانی اردو غزل (۱۹۷۰ء کی دہائی کے حوالے سے)۔ لاہور: ابلاغ پبلشرز، ۲۰۰۱ء۔
اقبال، ظفر۔ ''خالد اقبال یاسر کی شاعری۔'' پیچیان ۳۔۵ (۲۰۰۱ء)۔
امیر، رؤف۔ ''پاکستانی غزل کے چند زاویے۔'' ادبیات ۱۲، ۱۱، ۱۰ (اکتوبر ۱۹۸۹ء)۔
بیگ، مرزا حامد۔ ابتدائیہ عناصر۔ غلام حسین ساجد۔ لاہور: اورینٹ پبلشرز، ۱۹۹۳ء۔
بیگ، مرزا حامد۔ فلیپ موسم۔ غلام حسین ساجد۔ لاہور: خالدین، ۱۹۸۵ء۔
جمال، نجیب۔ ''معاملہ کی غزلیں۔'' انگارے، ساتویں کتاب۔ ملتان: ۲۰۰۲ء۔
جمیل، قمر۔ دیباچہ پرس زاد۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء۔
چشتی، ظفر۔ ''محمد اظہار الحق کی پری زاد۔'' ادب و ثقافت (جولائی ۲۰۰۶ء)۔
خالد، محمد۔ ''دروبست کا شاعر، خالد اقبال یاسر۔'' پیچیان ۳۔۵ (۲۰۰۱ء)۔
خالد، محمد۔ دیباچہ نئی پاکستانی غزل، منتخب و مرتبہ غلام حسین ساجد۔ لاہور: خالدین، ۱۹۸۱ء۔
ساجد، غلام حسین۔ ''اردو غزل بیسویں صدی میں۔'' آئندہ (دسمبر ۲۰۰۰ء)۔
ساجد، غلام حسین۔ ''پاکستانی اردو ادب کے ساٹھ سال۔'' ادب لطیف ۱۱ (نومبر ۲۰۰۷ء)۔
ساجد، غلام حسین۔ ''رس رچنا کا۔'' شمام و سحر ۵۔۱۸ (مئی ۱۹۹۵ء)۔
ساجد، غلام حسین۔ ''نقش کوئی کمال کا۔'' انگارے (اگست ۲۰۰۳ء)۔
ساجد، غلام حسین۔ کتاب صبح۔ لاہور: سارنگ پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء۔
سدید، انور۔ ''۱۹۷۵ء کی غزل۔'' اوراق ۱۲۔۸، ۷ (جولائی۔ اگست ۱۹۷۶ء۔
سندیلوی، رفیق۔ ''غلام حسین ساجد کی غزل۔'' آفاق خاص نمبر (س ن)۔
سہیل، عامر۔ دیباچہ کتاب صبح۔ لاہور: سارنگ پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء۔
صدیقی، ریاض۔ ''نامعلوم سے مکالمہ۔'' انگارے ۲۹ (مئی ۲۰۰۵ء)۔
ضیاالحسن، مرتبہ گمشدہ ستارہ۔ لاہور: اظہار سنز، ۲۰۰۲ء۔
فاروقی، شمس الرحمن۔ ''عناصر، غلام حسین ساجد کے حوالے سے۔'' آئندہ ۳۔۱۲ (نومبر، دسمبر ۱۹۹۸ء)۔
منیر، سراج۔ ''یہ رنگ اک خواب کے لیے ہے۔'' معاصر ۲ (اگست ۱۹۸۳ء)۔
ہاشمی، طارق۔ دیباچہ اردو غزل نئی تشکیلیں۔ اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۸ء۔